OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

محمد عاصم بٹ کے ناول "بھید "میں وجودیت

Existentialism in Muhammad Asim Butt's Novel *"Bhaid"*

Dr. Fareed Hussaini
Assistant Professor, Department of Urdu,University of Chakwal, Chakwal
Dr. Ahmed Hussain Hadi
Houston, (USA)
Abdul Raziq
Lecturer, Department of Pakistani Languages, NUML Islamabad

Abstract

In 20th century existentialism theory introduced in Europe in literature and decided to discuss the relations between individual and universe or creator. In Fiction writers like Albert Camus, Fyodor Dostoevsky, Jean- Paul Sartre, Frannz kaflea etc got fame in this context, specially, the stranger, and crime punishment, Nausea, respectively considered Master pieces. In subcontinent partition is third dilemma in addition to two World Wars. So the Question of existence of man arose after displacement and Continuity of colonialism in different forms. In Urdu Literature fiction writers also took it as subject but only few of them succeeded to apply existentialism theory in novels. Because, the techniques, require for this subject are, not easy. Muhammad Asim Butt influenced by Franz

CC BY

kafks in terms of style and technique. He wrote this novel in an absurdist, unorthodox and bizarre fashion. Apparently, the events described in simple language but between the lines multiple meaning is existed. Butt portrayed a multishade picture of our society. In this article efforts have been made to depict the reality lies in *Bhaid.*

Key Words: Existentialism, Asim, theory, Lahore, Culture

تمہید

ازمنۂ قدیم سے قصہ کہانی انسانی دلچسپی کا زریعہ رہی ہے۔ ابراہمی مزاہب سے قبل یونانی، مصری، ابابلی اور ہندہ اساطیر اس کا بین ثبوت ہیں چنانچہ اوڈیسی (یونی)، گِل گامش (بابلی)، کتھاسرت ساگر اور جاتک کتھا (ہندی) وغیرہ تخلیق ہوئیں جو بیک وقت لسانی اور ادبی چاشنی لیے ہوئے ہیں۔ الہامی کتب میں بائیبل اور قرآن مجید کے قصص محتاج بیان نہیں اور حیرت انگیز طور پر زباندانی کا شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی کے لوازمات سے بھی متصف ہیں کیونکہ بحر حال ان کے مخاطب انسان ہیں۔

جدید فکشن

ناول کو انڈسٹرئلائزیشن کی پیداوار کہا جاتا ہے۔ یہ مغربی ایجاد ہے جس میں فوق الفطرت عناصر کو منہا کر کے فوکس فقط انسانی زندگی کو بنایا گیا۔ عام آدمی کی بصیرت شرح خواندگی کی بدولت چونکہ بلند ہو چکی تھی پلاٹ کو الجھاؤ میں ڈال کر کرداروں کی نفسیات کو زیادہ پیچیدہ بنایا گیا۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے فکشن میں تکنیکی امور پر خصوصی توجہ دی گئی

وجودیت کا پس منظر

وجودی تھیوری(Existentialism) بنیادی طور پر فلسفیانہ اساس کی حامل ہے جو ما بعد نو آبادتی مطالعات کا ماحصل ہے۔ یہ تین اجزاء کا مرکب ہے جن میں phenomology (شعور)freedom(آزادی) اور authenticity(مصدقہ)شامل ہیں۔ جدیدیت جو انڈسٹرء لا ئزیشن کی چکا چوند کی کوکھ سے بر آمد ہوئی، نے فرد اور معاشرے کی کایا کلپ کر دی۔ کالونیل سسٹم نے روایت، سماجی سیاسی اور معاشی ڈھانچے کی چولیں ہلا ڈالیں اور یوں زیردست اقوام کے نظام زِیست کے اندر پیراڈئم (Para digm)شفٹ آگیا۔ دو عالمی جنگوں نے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں بھی افراد کی وجودیت پر سوالیہ نشان لگا دیا چنانچہ ادب میں ٹی۔ایس ایلیٹ، فرانز کافکا اور البرٹ کامیونے مزکورہ تھیوری کو اپلائی کر کے نئے چلن متعارف کروائے ازاں بعد ویسٹ لینڈ(نظم)مقدمہ ناول(اور اجنبی (ناول) تخلیق ہوئے گو کہ اس سے قبل دوستو فسکی انیسوں صدی کے نصف آخر میں اپنے فکشن میں زیریں سطح پر اسے برت چکے تھے۔ اردو ادب کے شاہکار کا لونیل کھنڈرات کے ملبے پر کھڑے ہو کر لکھے گئے۔

قراۃالعین حیدر اور ن۔م راشد عبداللہ حسین، انتظار حسین وغیرہ اسکی مثالیں ہیں۔ یہاں بھی دو ستو فسکی کی طرح میر اور غالب انفرادی آشو ب کو اپنے فن میں پیش کر چکے تھے۔برصغیر میں تقسیم کے پس منظر میں ہر فنکار نے فر د اور سماج کے باطن اور ظاہر کوموضوع بنایا۔ سیاسی مدوجزر کے نتیجے میں اتھل پتھل کو تخلیق کاروں نے فنی استطاعت کے مطابق فن پاروں میں ڈھالا۔ افسانوی ادب میں مس حیدر، عبداللہ حسین اور انتظار حسین نے فرد کے وجود کو بنیادی سرو کاربنایا۔ بیسوں صدی کی آخری دہایوں میں مغربی ادب کے تراجم نے اردو لکھار یوں کو تکنیک اور اسلوب کے نئے ذائقوں سے روشناس کروایا چنانچہ اکیسویں صدی کے نئے ناول نگاروں کے ہاں اس کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔

عاصم بٹ کی ناول نگاری

محمدعاصم بٹ کا شمار ان فنکاروں میں ہوتا ہے جو غیر ملکی زبانوں کے خصوصاً انگریزی سے براہ راست مستفید ہوئے۔ اوائل جوانی میں انھوں نے کا فکا کہا نیوں کے تراجم کئے اور بعدازاں ان کے افسانوں میں کافکا ئی اثرات بین السطور نمایاں ہونے لگے۔محمد عاصم بٹ کا ناول" بھید " Existentialism کی ہیت اور تکنیک میں لکھا گیا شعوری کاوش کا عمدہ نمونہ ہے۔ پلاٹ(Broken images) طرز پر پانچ حصوں میں مندرجہ ذیل ذیلی عنوات لیے ہوئے ہے: (ا) تمہید، مسودہ (۲) ہیروئ(۳) سید غائب علی شاہ، کہانی فروش، ماسٹر ولایت احمد، ڈٹر جنٹ والی لڑکی، نمیرا، نوید،(حصہ دوم)لکھاری، مولوی صاحب کے نام ایک خط، مجید للاری، مشتاق چھرا، روزنامہ،الحمراء ا، مٹھوایلین، آخری اخباری نوکری سے آزادی، ریاض مودا، چائے کی پیالی اور سموسے،(حصہ سوم)ہیرو کی کہانی روزنامہ مائیہ ناز،متروک کردار(حصہ چہارم)کلا نکس، روپ سروپ، مجذوب کی پکار، محلہ موہلیاں، ہوا بسری، چاند بسری،(حصہ پنجم)اختتام، مسودے پر آخری نوٹ۔دورانِ قرات کہانی میں مسرت اور ترغیب ہر دو کا ثبات ملتا ہے جو ادب کی عظمت کے معیار تصور ہوتے ہیں مگر" بھید "میں اس سے بڑھ کر بھی کچھ ہے مثلاً جو لانجائنس نے کہا تھا":اس(ادب)میں ایسی جمالیاتی قوت ہوتی ہے جو آدمی کی پوری ذات کو متاثر کرتی ہے۔"[1]

لفظ اور لکھت اپنی معنویت کھو چکے، اس احساس زیاں کو باور کروانے کے لیے ناول کی تمہید مسودہ نامی سے ہوتی ہے جوراوی کو دورانِ سفر ایک بَس میں ملتا ہے":جناب والہ، یہی میلا کچیلا مسودہ اس وقت میرے سامنے میز پر دھرا ہے۔ میلے لفا فے میں لپٹا ہوا جس پر لال رنگ کی ڈوری بندھی ہوئی ہے۔ ایک سال ہو گیا جب یہ مجھے ملا تھا۔ اس دوران میں یہ گھر سے میرے دفتر میں منتقل ہوا اور پھر اسے گھر میں لے آیا ہوں۔ اس دوران میں اسے ایک سے زائد بار پڑھ چکا ہوں۔"[2]

وجود اور عدم وجود پر بحث ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں" سید غائب شاہ "عنوان کے ذیل میں ملتی ہے۔ روایتی معنی میں یہ ضعیف العقیدگی، توہم پرستی اور جہالت کی علامت ہے مگر جدید تعبیر No Extistance کی طرف اشارہ ہے کہ جس چیز کو مدار المہام سمجھا جا رہا ہے وہ حقیقت میں واہمے کے سوا کچھ نہیں":حضرت پیر سید غائب شاہ پیر بھولے شاہ کے مرشدوں میں سے تھے۔ یہیں اس شہر میں دفن تھے لیکن نظروں سے اوجھل، تبھی تو غائب شاہ کہلائے، بس غائب ہوگئے،نہ کوئی مزارنہ کوئی نشان۔ ان کا عرس منایا جاتا تھا۔"[3]

یہاں ناول نگار نے داراشکوہ کا ذکر بھی کیا ہے جومیاں میر کا متعقد، بھگتی، مہذب، سلطنت ہند کا ولی عہد، سفینت الاو لیا ء کا مصنف جو سید غائب شاہ کی بد دعا کا شکار ہوگیا۔ یہاں البرٹ کا میو کا مضمون "The Myth of Sisyphus"یاد آتا ہے جو ۱۹۴۲میں شائع ہوا جس میں شوپن ہار اور نطشے کے فلسفے کی بازگشت موجود ہے:

> "The absurd lies are the juxta position between the fundamental human need to attribute meaning to life and the unreasonable silence of the universe in response."

بنیادی انسانی ضرورت کے جواب میں قدرت کی غیر منطقی خاموشی پر علامہ اقبال کا مندرجہ ذیل شعر عمدگی سے روشنی ڈالتا ہے جو دار شکوہ کی شکست کی بالواسطہ توضیع بھی ہے":

اثر کرے نہ کرے سن تو لے میری فریاد نہیں ہے داد کا طالب یہ بندہ ء آزاد[4]

وجودی تھیوری میں فرد کی چوائس اہم ترنکتہ ہے۔ کیا وہ سماج میں اپنے لیے جینے کی کوئی راہ ڈھونڈ سکتا ہے یا یہ اختیار کسی اور کے پاس ہے۔بھید میں ڈٹیرجنٹ پاوڈر والی لڑکی صارفیت (consumerism) کی نمائیدہ ہے، جو انڈسٹرء لا ئزیشن کی معراج کا استعارہ ہے یعنی دوٹکے کا صابن اور پا وڈر فروخت کروانے کے لیے تخلیق کی رفعت اور کا ئنات کے رنگ) عورت(کو سربازاررسوا کیا جا رہا ہے۔ یہاں نو جوان دوشیزہ کے لیے زندگی کی بے معنویت اپنا اثبات کرتی ہے۔ناول نگار نے دلفریب انداز میں سیل گرل کا نقشہ کھیچا ہے جو طنز کی کاٹ سے بھرپور ہے۔

"ڈیٹر جینٹ پاوڈر کا نیلے رنگ کا پلاسٹک کا تھیلہ ہاتھ میں پکڑے، مسکراتے ہوئے وہ چوک کے دائیں طرف کھڑی تھی۔ اپنے قد سے بڑے حجم کے بورڈمیں، سو چو سخت گرمی میں اس کی مسکراہٹ ٹھنڈی پھوارسی ہے۔یہ نہ ہو تو چوک شایدہی کسی کو دکھائی دی۔ اپنی قیمتی مسکراہٹ اس میں بیس پچیس روپے قیمت کے معمولی ڈیٹرجینٹ پاوڈرکے لیے بازار کی زینت بن رہی تھی۔ یہ نئی منڈیائی دنیا کا (Marketing World) ایک رنگ ہے۔"[5]

مندرقبہ بالااقتباس میں آخری دو جملے)جو اضافی معلوم ہوتے ہیں (افسانوی رنگ کے لیے ضعف کا باعث بنے ہیں۔ اس طرح کئی تفسیری سطریں بنا ئی گئی تہہ د اری کو unfold کردیتی ہیں جو ناول کی کمزوری ہے۔ اس حصے میں عورت کا استحصال دکھانا مقصود ہے جو کال سنٹر،ہو ٹلوں کی ریسپشن(Reception) سے لے کر بس ہو ئٹس اورجوتوں کی دکانوں تک میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔پورے بیان میں ادبی حسن موجود ہے جو قاری کو جذباتی طور پر تحریک دینے کی قوت سے بھرپور ہے جو قاری کے جذبات کو اپیل کرتا ہے بقول لانجائنیس وہی ادب پارہ حسین ہے جس میں تخیلاتی جذباتی طور تحریک دینے کی قوت ہو۔"[6] ظالم اور مظلوم طبقات ہر دو وجود اور عدم کی بھول بھلیوں میں گم ہیں۔ موخر الذکر وجود رکھتے ہوئے بھی Listless ہے جبکہ اول الذکر نظر نہ آکر بھی ہر سمت اپنا اثبات رکھتا ہے۔ ناول میں اسے Allians کے نام سے پکارا گیا ہے:یہ ڈائنو سار بھلا کیا تھے، یہی ایلنیز تھے باواجی، ایلینز۔ سب مارے گئے۔پتہ نہیں کیسے۔ لیکن اب پھر سے آئے ہیں۔"[7]

مختلف ٹکڑوں(Fragments) کو جوڑ کر بٹ نے جو کہانی ترتیب دی ہے اس میں زندگی کی بو قلمونی کے علاوہ اسلوبیاتی تنوع بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہیں تو کھردری حقیقت نگاری کے پیرائے میں تلخ تجربے بیان ہوئے ہیں اور کسی جگہ رومانوی انداز نگارش سے تحریر میں جا ذبیت پیدا کی گئی ہے۔گو کہ یہ مواقع پلاٹ میں کم کم آئے ہیں مگر کیفیت کے لحاظ سے ارفع ہیں۔ اس بابت لڑکی نمیرا والا باب خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔یا دماضی اور ناستلجیا(Nostalgia)سے بھر پور ٹکڑا ملا خط ہو":وہ تمام سا حر آنکھیں جو میں نے دیکھیں اور جو میری یادداشت میں نقش ہو گیئں۔ وہ آواز یں جو میں نے سنیں، جن کا تر نم آج بھی کانوں میں رس گھولتا ہے اور وہ سب صورتیں جن کی طرف نظر کھنچتی ہے اور وہ سارے پر کشش ہونٹ، رخسار، جسم کے نشیب وفراز، خدوخال کیسے ایک پیکر میں مجتمع کر سکوں گا۔"[8]شعوری بے تر تیبی میں ما بعد نو آبادیا تی مسائل کو عام نیم خواندہ کر داروں کے توسل سے اجاگر کیا گیا ہے۔ تاریخ کے تناظر میں کا بینہ مشن پلان کی نا کا می، وائسرائے کی عجلت میں تبدیلی باونڈ ری، کمشین کی مضحکہ خیز تجاویز، آبادی کے تبادلے، یو نیسنٹ پارٹی کی پنجاب میں حکومت کا خاتمہ وغیرہ کتنے ایسے اقدامات پیش آمدہ واقعات کی چغلی کھارہے تھے مگر عوام الناس اور حتی کہ سطحی لیڈر شپ بھی ان عوامل سے لاعلم تھی۔ مہاجرت کے دوران قتل و غارت گری، تین جنگیں، سقوط ڈھا کہ وغیرہ جیسے حادثات نے تاریخ پر کی جمی گرد کی تہہ کو ذرا سا صاف کیا مگر کا لو نیل بیا نیہ اتناComposite اورFool Proof تھا کہ وہ اب بھی Exist کرتا ہے۔ ناول میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے":کوئی گورنمنٹ ہو تو لمبی منصوبہ بندی کرے(قریب ہو کر رازداری کے انداز میں) سب اندر سے رلے ہوئے لگتے ہیں باؤ صاحب۔۔۔۔پہلے جرمنوں نے مت ماری،

پھر بر طانیہ نے، اب امریکی، یہ چٹے ہمارے ہی ویری کیوں ہیں۔ باقی دنیا کو نہیں چھیڑتے، انڈیا سکھ چین سے ہے۔ وہاں کیوں نہیں جاتا امریکہ، ہمیں ہی آکر انگل دیتا ہے۔ کھوتے دا پتر۔"[9]

ناول کے اسی بیان کی اہمیت جاننے کے لیے ہمیں تاریخ کتابوں سے گواہی مل جاتی ہے مثلاًنامور مورخ ڈاکٹر مبارک علی راقم طراز ہیں":جب اہل یورپ نے ایشاوافریقہ کے لیے ملکوں کو اپنی نو آبادیات بنایا تو یہا ں کے لوگ سیاسی اور معاشی طور پر نئے نظام سے متاثر ہوئے۔ ان کے ذرائع،کو لوٹا کھسوٹا گیا، ان کی دولت کو غصب کیا گیا اور لوگوں کا استحصال کیا گیا، جس نے ان ملکوں کو اور غریب بنا کر رکھ دیا"[10]بظاہر نو آبادیا تی نظام ختم ہو چکا مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ سپر پاور کے طور پر تیسری دنیا کے ممالک کا آقا بنا ہوا ہے۔عاصم بٹ نے اپنی لکھت میں جدید مغربی تکنیک سے خوب کام لیا ہے۔ دوران قرأت ان کی اپنی شخصیت کہیں دکھائی نہیں دیتی بلکہ واقعہ یا کر دار اپنا ثبات کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں خوزے مریا کاستی لت نے کہا ہے":جدید ناول میں خود مصنف کی ذاتی شخصیت کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس کے دو نتائج نکلتے ہیں پہلے یہ کہ ناول میں واقعات و سا نحات کے بتدر نج عروج کے ساتھ اس کا اسلوب اسی اعتبار سے فہم اور غیر فہم ہو جاتا ہے۔دوسرے یہ کہ بیا ن کردہ واقعات پیچیدہ اور دقیق بن جاتے ہیں، یہ امورجیمز جائس، کا فکا اور فا کنز کے جدید ناولوں میں نما یا ں ہیں۔"[11]

جدید یت کے طوفان میں روایت کے شجر کی جڑیں تک ہل گئیں۔ نو آبادیاتی نظام میں کچھ تبدیلیا ں Deliberatelyلائی جا رہی تھیں جو مشرقی روایت اور سیاسی، معاشی نظام کی کایاپلٹ کا باعث بنی مگر کچھ عمل غیر محسوس طریقے سے دھیرے دھیرے سماج میں سرایت کرتے رہے۔ تخلیقی فن کاروں نے پوسٹ ماڈرنزم مطالعات سے قبل ہی اس طرف نشاندہی کر دی تھی مگر متاخرین نے اپنے تخلیقی تجربے میں اس مسئلے کو برتا۔ محمد عاصم بٹ نے بھید میں اس تبدیلی کو بیان کیا ہے کہ کس طرح انسان فطرت سے دور ہوتا جا رہا ہے اور زندگی کے الجھاؤ کو مزید گنجلک کرنے پر تلا ہے۔ یہاں کرداروں کے پردے میں صورتحال کی وضاحت کی گئی ہے":اٹھ جاؤ اللہ کی بندی۔ چڑیاں کبوتر تم سے اچھے جو صبح سویرے جاگتے ہیں، اللہ کا نام لیتے ہیں۔ بیوی نے بے زاری سے کروٹ بدلی۔ اس کے لیے صبح جلدی اٹھنے سے زیادہ ضروری پوری نیند لینا ہوتا ہے تا کہ پورا دن بغیر آرام کئے کام کرنے جوگی ہو سکے۔"[12]کہانی میں قاری کو جگہ جگہ وعالمی ماحول کی عکاسی ملتی ہے:

> "دوپہر میں سفید آگ سے آنکھیں چند ھیا نے اور ماس جلنے لگے تو اپنے برٹش کونسل کی لا
> بریری کی عمارت سرخ نہیں بلکہ سبز معلوم ہوتی ہے اور اس کے اندر دل جیسا دھڑکتا ہوا

ریڈنگ روم اپنی آغوش میں لینے کی بے چینی میں مبتلا عمارت سے باہر نکل پڑتا ہے۔ وہ آپ کو لوری سنا تا ہے، مسکراتا رہتا اور اپنا دیوانہ بنا لیتا ہے۔"[13]

یہاں کتب خانہ کو ماں کی گود اور اس کے ماحول کو میٹھی لوری سے تشبیہ دے کر فنکار نے علم و ادب کی اہمیت کواجاگر کیا گیا ہے دوران خواندگی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جیسے لکھنے والوں کولکھنے کے ڈھنگ سکھائے جارہے ہوں خصوصاً فکشن کی تخلیق کے لیے۔ پلاٹ کی بے ترتیبی اور سہل زبان کے استعمال گویا در پردہ ترغیب بھی موجود ہے۔ ایک مقام پر باقاعدہ ناول لکھنے کا فارمولا بھی درج ہے کہ کہانی لکھو پھر رکھ کے بھول جاؤ پھر کچھ عرصہ بعد دوبارہ Review کرو پھر سے لکھو وغیرہ۔ یہاں وزیر آغا کی کتاب تخلیقی عمل کی طرف دھیان جاتا ہے جس میں انھوں نے گراہم ویلس Graham Wallace اور کیتھرائن، پیٹرک(Katherine Patrick) کے حوالوں سے تخلیق کے چار مدارج گنوائے ہیں،تیاری، پرورش، تنویر اور تصدیق۔"[14]تیاری میں فن کا زیادہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں ناکامی سے اکتا کر تخلیقی عمل سے دست کش ہو جاتا ہے بے قراری اور تشنج ہے اور تیسرے مرحلے میں خیال باطن سے یکدم ظہور پذیر ہوتا ہے اور آخر میں تخلیق کی نوک پلک سنواری جاتی ہے۔مود کے شکار معاشرے میں سوال اٹھانے کی روایت ختم ہو جاتی ہے اور یوںSterio type نسلوں کی سائیکی کا حصہ بن جاتی ہے۔ ناول نگار اس حقیقت سے آگاہ تھے تبھی شعور ی طور پر وہ ایک کردار الیاس مندریاں والے کے وسیلے سے قلم و قرطاس کا تذکرہ کرتے ہیں اور سوال کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتے ہیں":اس کے اندر سوالوں کا کولھو چلتا رہتا ہے۔ سوال آگ لگاتے ہیں۔جلا کر راکھ کر ڈالتے ہیں اور جواب پانی کی پھوارع بن جاتے ہیں۔[15]"

اور کتابوں سے جڑے بغیر سوال و جواب دونوں ممکن نہیں اورکتاب ہی دراصل وہ بھید ہے جس میں کامرانی چھپی ہے بقول و الٹیئر آپکو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیے کہ جب سے دنیا بنی ہے وحشی نسلوں کو چھوڑ کر دنیا پر کتا بوں نے حکومت کی ہے۔[16]کہانی میں کہیں کہیں جھول ہیں مثلاًمولوی اور لاوڈ سپیکر کے بیان میں غیر ضروری طوالت موجود ہے۔ لکھاری وعظ ونصائح کی بے وقت ر اگنی اور ایمپلی فائر (Emplyfier) کے فائر کی زد میں ہے(یوں تو پورا محلہ بلکہ کئی محلے متاثرین میں شامل ہیں)وہ روبرو واعظ سے شکوہ کرنے سے ڈرتا ہے تبھی طویل بے نامی خط کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے۔ اس عمل میں کلیسائی محتسب اور اسکا دبدبہ دکھانا مقصود ہے":شکایت، آپ سے نہیں آپ کے سپیکروں سے ہے۔ ہوسکتا ہے یہ آپ کے اختیار سے باہر ہوں، اپنی من مانی کرتے ہوں ہو سکتا ہے انھیں استعمال کرنے کی آپ کی خواہش آپکے اختیار سے باہر ہو یہ سپیکر اس خواہش کو بے قابو کرنے میں بنیادی کردارادا کرتے ہیں۔"[17]

بھید اپنے عہد میں پنپنے والے سماج کے درون تک رسائی کرتا ہے۔انسانی باطن میں تہہ در تہہ پیچیدگیوں کے گنجل کھولنے کی کا میا ب سعی ہے۔منہ زور اور جا بر ان دیکھی قوتوں کی بچھائی گئی بساط پر وجودی کرب میں مبتلا فر د خود پر سرارشے بن چکا ہے۔نہ صرف سی فن پارہ معاصر فکشن میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے بلکہ خود نا ول نگار کے پہلے دونوں ناولوں سے بھی یکسر مختلف ہے۔کہانی میں مصنف کے اپنے دیس کے سیاسی منظر نامے کو پیش نظر رکھا گیاہے وہ منظر نامہ جس نے پون صدی میں سماج، معاشرت تعلیم اور تہذیب کے عمومی موڈ کو بدل دیا، اور جس کے کارن بین الاقوامی برادری میں قومی امیج کو ضعف پہنچا۔ عالمی طا قتوں کی رقابت میں ظہور پذیر ایک عنصر کی طرف اشارہ کرتے ناول میں ایک مقام پر درج ہے":طالبان پر یشر یا پاکٹس ہیں، کس کے لیے کام کرتے ہیں۔ جوان سے لڑتے ہیں وہ انھیں بتا تے بھی ہیں۔ دنیا کا نظام دو دھاری ہے مثبت منفی سب اکٹھا ہو رہا ہے"[18] نصابات کے علاوہ زرد صحافت بھی جہالت کے فروغ میں اہم کرتی ہے۔ طاغوت کا عوام الناس کو زیر نگوں رکھنا ازل سے اوپن سیکرٹ چلا رہا ہے۔ زیر تبصرہ ناول میں کاروباری ضرورتوں اور پیشہ ورانہ بددیا نتی کی مثالیں دی گئی ہیں جو سماج میں سدھا ر کی بجائے بگاڑ کا سبب بنی ہیں اور جن کی بدولت خواندہ (جن کی تعداد پہلے بھی قابل رشک نہیں)افراد تو ہمات کے اسیر ہوتے چلے گئے۔ قسمت کا حال، ستارے کیا کہتے ہیں، ہا تھ کی لکیریں بولتی ہیں، اگلہ ہفتہ کیسا رہے گا وغیرہ کے ذیلی عنوانات کے تحت سر کولیشن بڑھانے کے سامان کئے جاتے ہیں مگر بالواسطہ اس کے بھیانک نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ پوچھے گئے سوالات کے جوابات کتنی مہارت سے دیے جاتے":اس کا فارمولہ بہت آسان تھا کہ ایسی صوفیا نہ اور شاعرانہ زبان لکھی جائے جو مبہم اور غیر حتمی ہو مثلاً یہ لکھنے کی بجائے کہ کیا کچھ، کب تک ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ لکھا جائے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا وقت آنے پر۔روزگار میں بہتری ہو گی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے کا خطرہ ہے وغیرہ وغیرہ۔"[19]

ناول نگار نے آدمی کی زبان میں بڑی حقیقتیں بیان کی ہیں۔ مکالموں میں سادگی کے باوجود پر کاری ہے جو فکشن کی فنی نزاکتوں سے آگاہی پر دلالت کرتی ہے۔ عابد علی عابد نے اپنی کتاب اسلوب میں لکھا ہے":لوکس کی نظر میں فنکار کی شخصیت اتنی اہم ہے کہ جہاں فنکار جذبے سے بالکل کٹ کر کچھ قانونی قسم فیصلے دیتا ہے وہاں بھی اپنے قاری کو جما لیاتی طور پر متاثر کر سکتا ہے شرط یہی ہے کہ فنکار کو یہ بات معلوم ہو کہ اسے جو کچھ کہنا ہے وہ اس طرح ترتیب اور تشویق کے انداز میں کہنا ہے کہ بات قاری کے درگوش پر دستک دے اور فوراًدل میں اتر جائے"[20]

ناول میں لفظ کی حرمت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کیونکہ جس سماج میں جہل علم گرد انا جائے اور بہروپیئے دانشمند کہلائیں اور اہل علم کی کوئی توقیر نہ ہو وہاں تخلیق کار کا فریضہ ہے کہ وہ صداقت کا دامن پکڑے رہے۔ مسودہ

سے شروع ہونے والی کہانی مسودہ پر ہی اختتام پذیر ہوتی ہے فنی وفکری ہر دو سطحوں پر یہ ناول عاصم بٹ کی عمدہ تخلیق ہے جس میں کرداروں کے ذریعے صورت واقعہ کا حوال بیان کیا گیا ہے اور بلاشبہ یہ اپنے زمانے کے مثائل کو زیر بحث لایا ہے کیونکہ بقول خالد اشرف بحر حال ناول کا بنیادی فریضہ اپنے عصر کے سماجی حالات اور مسائل کی پیش کش ہی ہے۔"[21]

بطور تخلیقی فنکار وہ نہ صرف سماج کہ جڑوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ ان کی نفسیات کو فنی سطح پر کمال مہارت سے برتا ہے۔ اسے اگر کرواری ناول کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ناول کی اختتامی سطور ملاحظہ ہوں":دوستو تو یہ ہے کہ ہم سب گم شدہ مسودون کے کردار ہیں اور اپنے انجام سے جو لکھا جا چکا ہے بے خیر ہیں۔ گو اس کے تابع ہیں لیکن اس پر قادر ہونے کی خواہش میں اتا ولے ہوئے جاتے ہیں، بھلے ہی یہ درست ہو کر ہر واقعہ خیر کے کا ئناتی پھیلاؤ کے عمل کا حصہ ہوتاہے مگر ہم چاہتے ہیں ہمارا انجام ہمارے ہی مطابق ہو اور نہ ہم کبھی اپنے مطابق بدلنے کی خواہش سے دستبردار ہو نگے"۔[22]

ایک سوال البتہ متن میں مکرر قاری کے سامنے اٹھتا ہے کہ جبر کی قوت کون ہے؟کون ہے جو کاتب تقدیر ہے؟ کون ہے جو آدرشوں اور آرزوں کے سامنے بند باندھے ہوئے ہے۔ کیا وہ آسمانی دیوتا ہے یا زمینی خدا؟ اسکا جواب ہے" بھید"۔

خلاصۂ بحث

جدید تکنیک کہانی کے قدرے کمزور پہلوؤں کو بھی چھپا دیتی ہے۔ناول بھید میں تیسری دنیا کے عوام کی لاچاری اور بے بسی کو موضوع بنایا گیا جہاں سرمایہ دارنہ نظام اور آبادیات کی باقیات سمیت کشی طاقتیں رویہ عمل ہیں۔ انسان کا وجود بظاہر موجود ہے مگر اس کی شخصیت بے بساعتی کی چکی میں پِس کر ایک ہئولائن چکی ہے۔ استحصالی قوتوں نے مِل کر فرد کی ذات جبر کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ تمام تر جبروت کے باوجود انسان انفرادی حیثیت کو بچانے کی تگ ودو میں سرگرم عمل ہے۔یوں ناول کی بجائے جہدِ مسلسل کا پیغام لیے ہوئے ہے۔

References

[1] Sajjad Baqir Rizvi, *Maghrib key Tanqeedi Usool* (Islamabad: Idara-e-Qaumi Zaban, 2021 AD), 118.

[2] Muhammad Asim Butt, *Bhaid* (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2018 AD), 118.

[3] Asim Butt, *Bhaid,* 113.

[4] Allama Iqbal, *Bal-e-Jibreel* (Lahore: Ravi Publications, NIL), 36 .

[5] Asim Butt, *Bhaid,* 21.

[6] Sajjad, *Maghrib key Tanqeedi Usool*, 118.
[7] Asim Butt, *Bahaid,* 113.
[8] Asim Butt, *Bhaid*, 39.
[9] Asim Butt*, Bhaid*,39
[10] Dr. Mubarak Ali, *Tareekh ki Awaz* (Lahore: Tareekh Publications, 2021 AD), 157.
[11] Fakhir Hussain, Adab aur Adeeb (Lahore: Nigarshat, 1988 AD), 158.
[12] Asim Butt, *Bhaid,* 30.
[13] Asim Butt, *Bhaid,* 30.
[14] Wazeer Agha, *Takhleeqi Amal* (Lahore: Makataba-e-Alia, 1983 AD) 84.
[15] Asim Butt, *Bhaid,* 25.
[16] Dr. Saleem Akhtar, *Pakistan mein Urdu*, Saal be Saal (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1988 AD), 149.
[17] Asim Butt, *Bhaid,* 108.
[18] Asim Butt*, Bahid*, 129.
[19] Asim Butt, *Bhaid,* 107-108.
[20] Abid Ali Abid, *Usloob* (Lahore: Majlis Traqi Adab, AD), 60.
[21] Dr. Khalid Ashraf , Barr-e-sagheer Mein Urdu Novel (Lahore: Fiction House, 2005 AD), 39.
[22] Asim Butt, *Bhaid,* 276.